اسلام پاکستان میں

(۲)

پروفیسر شیخ محمد عثمان

اس سے قبل اس مضمون کی جو قسط فروری ۱۹۶۷ء کے "فکر و نظر" میں شائع ہوئی ہے، اس کے پہلے حصے میں میں نے اپنی آبادی کے مختلف طبقوں کا اسلام سے وابستگی یا عدم وابستگی کے لحاظ سے تجزیہ کیا ہے اور دوسرے حصے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی، خلیفہ عبدالحکیم مرحوم اور جناب غلام احمد پرویز کے مذہبی افکار اور دینی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ پیش نظر حصہ میں میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ میرے نزدیک وہ کون سے امور ہیں جن میں ہماری مناسب توجہ اور خلوص عمل پاکستان میں اسلام کے مستقبل کو مستحکم بنا سکتے ہیں۔

(۱)

معاشی عدل کا قیام

بغیر تمہید کے پہلی بات تو میں یہ عرض کروں گا کہ اس ملک (اور شاید سب اسلامی ملکوں) میں اسلام کی آئندہ کامیابی کا سب سے زیادہ انحصار اس امر پر ہے کہ ہم مسلمان اپنے معاشرے کی موجودہ معاشی خرابیوں اور شدید ناہمواریوں کو دور کر کے اس کی جگہ روحِ اسلام سے موافقت رکھنے والا معاشی نظام قائم کریں۔ مجھے یقین ہے کہ دنیا کے مخلص اور دانا مسلمانوں کا اس سوال پر اختلاف رائے نہیں ہو سکتا کہ معاشی معاملات میں اسلام کی تعلیم اور اس کا نقطہ نظر کیا ہے؟

آج کوئی معاشرہ نسل انسانی کے مجموعی شعور سے کٹ کر یا تاریخ کی قوتوں کے خلاف صف آرا

ہوکر زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اب اصل سوال اشتراکی یا غیر اشتراکی اور سامراج یا مزدور راج کا نہیں اصل سوال یہ ہے کہ نسل انسانی کا معاشی شعور ایک ایسے نقطے پر پہنچ چکا ہے، جہاں معاشی ناہمواریوں کا استمرار ممکن نہیں۔ تاریخ کی قوتیں مہلت تو دے سکتی ہیں، کھلی چھٹی عطا نہیں کرتیں۔ جدید معاشی شعور کا سورج جب سے طلوع ہوا ہے، بے شمار قوموں نے یا تو انقلاب اور جبر کے ذریعے یا تدریجی ترقی اور ارتقائی قانون سازی کی مدد سے اپنے عوام کے افلاس اور محرومی کا علاج کر لیا ہے۔ امریکہ، انگلستان اور مغربی یورپ کو ایک طرف اور روس، مشرقی یورپ اور چین کو دوسری طرف رکھ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی ملکوں کا معاشی بندوبست، 'مغرب' سے بھی پیچھے ہے اور 'مشرق' سے بھی۔ حالانکہ عدل و انصاف کا قیام اور شدید تفاوتوں کا انسداد اسلامی تعلیمات کا پہلا معاشرتی تقاضا ہے۔

ہر دور میں کچھ مسائل اور کچھ معیار بطور خاص ابھرتے ہیں، اور زندگی کے ناپ تول کا پیمانہ بن جاتے ہیں۔ معاشی انصاف آج کے دور کا پیمانہ ہے۔ جو معاشرہ، جو مذہب اور جو نظام فکر و سیاست اس پیمانے پر پورا نہیں اترتا، ناقص اور فرسودہ قرار پاتا ہے۔ لہٰذا اسلام کی بقا اور فروغ و استحکام کا راز اس امر میں مضمر ہے کہ ہم اسلام کے نام لیوا نہ صرف اپنے معاشرہ کی شدید ناہمواریوں اور تفاوتوں کو دور کریں بلکہ ان تفاوتوں کو دور کرنے کے تمام عمل کا رشتہ واضح اور غیر مبہم طور پر اسلام سے قائم و برقرار رکھیں۔ معاشی تفاوتیں آج نہیں تو کل تاریخ کی قوتوں کے ہاتھوں بھی مٹ جائیں گی۔ لیکن اس سرزمین میں اسلام کا بھلا اور اس کی بہترین خدمت یہ ہے کہ یہ ناگزیر اور اٹل معاشرتی تبدیلی اسلام کے ذریعے اور اسلام کے نام پر عمل میں آئے، بصورتِ دیگر اس بات کا اندیشہ ہے کہ ہمارا نیا معاشرہ اور اسلام ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ بن جائیں!

(۲)

عورت کے بارے میں اعتدال پسندی

عورت کے بارے میں ہمارا رویہ اور نقطہ نظر گزشتہ ایک سو برس سے مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں بھی ہمارے شعور اور فیصلے کا دخل کم ہے اور وقت کی قوتوں کا زیادہ۔ بعض صورتوں میں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود سوچنے اور طے کرنے کی بجائے اپنے آپ کو زمانے کی لہروں کے سپرد کر دینے کو زیادہ محفوظ اور نتیجہ خیز طرزِ عمل سمجھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ طریقہ کار کسی مہذب قوم کے

شایانِ شان نہیں۔

ہماری آنکھوں کے دیکھنے کی بات ہے کہ مسلمانوں کے اچھے اچھے گھرانے عورتوں کی تعلیم کے شدید مخالف تھے۔ برّصغیر میں انیسویں صدی کے وسط میں ہزاروں علماء یہ فتویٰ دینے کے لئے تیار تھے کہ بچیوں کو اسکولوں میں بھیجنا دین و دنیا کی تباہی مول لینا ہے۔ پھر یہ تعصّب اسکول کی تعلیم کے خلاف کم ہوتا گیا لیکن خواتین کی پیشہ ورانہ تربیت کے خلاف یہ صورت حال بدستور باقی رہی۔ بے شمار والدین یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی ڈاکٹر، نرس، وکیل یا جج بن سکتی ہے۔ پھر خواتین کا سیاسیات میں حصّہ لینے کا سوال اٹھا اور پہلے محاذوں پر ہارنے والوں نے مدافعت کی آخری صف کے طور پر یہاں مورچے سنبھال لئے۔ لیکن گزشتہ صدارتی انتخابات میں یہ مورچہ بھی سر ہوگیا۔ اب تعلیم و تربیت اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں خواتین کی شرکت کے متعلق ہمارے نقطۂ نظر میں خاصی معقولیت اور اعتدال پسندی آچکی ہے۔

لیکن جاننے کے قابل بات یہ ہے کہ اسلام جہاں خواتین کی تعلیم و تربیّت اور قومی زندگی میں ان کی شرکت کے خلاف کوئی انتہا پسندانہ قدغن نہیں لگاتا اور معاشرے کے اس نصف پر فکر و عمل کے دروازے بند نہیں کرتا، وہاں اخلاقی پاکیزگی اور جنسی حیا و حجاب اس کے نظامِ معاشرت کی روح ہے۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ بچیوں کو لکھنا پڑھنا مت سکھاؤ۔ وہ عورتوں کو کسی ہنر کی تربیّت دینے سے جو اُن کا ذریعۂ معاش بن سکے، منع نہیں کرتا۔ وہ ان کے جائز طریقوں سے کمانے اور اپنے کام کاج کے لئے گھروں سے باہر نکلنے پر بھی کوئی پابندی نہیں لگاتا لیکن مغربی معاشرت میں عورت کی 'آزادی' سے جو مفہوم لیا جا رہا ہے، اسلام یقیناً اس کی تائید نہیں کر سکتا۔ جنسی بے راہ روی اور بے حیائی اسلامی معاشرت کی ضد ہے۔

اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہمیں دونوں قسم کی انتہا پسندی سے بچنا چاہیئے۔ خواتین کی تعلیم، تربیت، حصولِ معاش اور قومی زندگی میں ان کی بلا روک ٹوک شرکت کے حقوق اصولاً ہم پاکستانیوں نے تسلیم کر لئے ہیں اور ان اصولی باتوں کے خلاف اگر بعض صورتوں میں کچھ ذہنی تحفظ یا تعصب پایا جاتا ہے تو وہ بھی رفتہ رفتہ دُور ہوتا جا رہا ہے لیکن یہ مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ملک کی خواتین کا ایک طبقہ، اگرچہ یہ طبقہ ابھی بہت ہی مختصر سا ہے، ان حدود کو پھلانگنے کی کوشش کر رہا ہے جو بے جا جنسی اختلاط، نمائشِ زینت اور معاشرتی بے راہ روی کے خلاف اسلام نے مقرر کی ہیں۔

پاکستان میں جو لوگ اسلام سے سچّی محبّت اور اس کے فروغ و استحکام میں حقیقی دلچسپی رکھتے ہیں،

ان کا فرض ہے کہ وہ اس مسئلے میں اعتدال کی راہ پر سختی سے قائم رہیں تاکہ ملک میں رائے عامہ کی ایک ایسی مؤثر فضا قائم ہو سکے جو نہ تو عورت کے ساتھ کسی ناانصافی اور حق تلفی کو برداشت کرے اور نہ اس بے راہ روی کی تاب رکھتی ہو جسے خواتین کا کوئی طبقہ آزادی کے نام پر اختیار کرنے اور مقبول بنانے کی کوشش کرے۔

(۳)

تعلیم کی اسلام سے ہم آہنگی

اپنے نظام معیشت کو اسلام کی معاشی ہدایات کے مطابق ڈھالنے اور مسلمان عورت کے بارے میں اعتدال پسندانہ رویہ اختیار کرنے کے بعد تیسری چیز جو میرے نزدیک ہماری فوری توجہ کی محتاج ہے، نظام تعلیم میں ایسی تبدیلیاں ہیں، جو اسے اسلامی ثقافت اور اسلامی تعلیمات کی روح سے ہم آہنگ کر دے

یہ معاملہ جذباتی طور پر تو ہم گزشتہ بیس برس سے حل کر رہے ہیں اور ملک کا کوئی قابل ذکر دانشور یا حاکم ایسا نہ ہوگا جس نے کسی نہ کسی وقت یہ نعرہ بلند نہ کیا ہو کہ ہماری تعلیم کو اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا چاہیئے لیکن یہ کیسے ہو اور تعلیم کے اسلامی اصولوں کے مطابق ہونے کے حقیقتاً معنی کیا ہیں، اس پر شاذ و نادر ہی غور فرمایا گیا ہے۔ میرے خیال میں موجودہ زمانے میں کسی ملک کے نظام تعلیم کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کا کام اتنا ہی مشکل اور نازک ہے جتنا کسی ملک کے لئے اسلامی آئین کا تیار کرنا۔ اور ہمارے اکثر دانش وروں کو معلوم ہے کہ اسلامی آئین کی ترتیب و تیاری میں ہم نے کیا کیا اور کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں اور کیسی کیسی کٹھنائیوں کا ہمیں سامنا رہا ہے۔

تاہم دو باتیں میں اس ضمن میں ایک گونہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اوّل یہ کہ بعض مضامین ایسے ہیں جن کی تدریس معمولی ردّ و بدل کے ساتھ تمام دنیا میں یکساں ہے۔ فزکس، کیمسٹری، باٹنی، زوآلوجی، جغرافیہ، ارضیات، فلکیات، ریاضی اور اسی طرح طبّ اور انجنیئرنگ، یہ ایسے سائنسی علوم ہیں کہ تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ روس میں بھی ویسے ہی پڑھائے جاتے ہیں جیسے مثلاً انگلستان میں یا امریکہ میں ان کی تدریس قریب قریب ویسی ہی ہے جیسی چین یا مشرقی یورپ میں۔ لہٰذا یہ علوم پاکستان میں بھی اسی طرح پڑھائے جائیں گے جیسے بھارت سمیت دوسرے ملکوں میں۔ ان مضامین کے طریقۂ تدریس میں ہم تھوڑا بہت مقامی رنگ پیدا کر سکتے ہیں۔ تاہم بحیثیت مجموعی ان مضامین کا مواد اور تدریس اپنی بین الاقوامیت قائم رکھے گی اور ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ اس میدان میں ہم ترقی یافتہ ملکوں کے

قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کریں۔

فلسفہ، نفسیات، سیاسیات اور معاشیات ایسے مضامین ہیں کہ بعض نظریاتی مملکتوں میں ان کی تدریس دوسرے ملکوں سے کچھ مختلف ہو سکتی ہے مگر جہاں تک ہماری علمی تحقیقات اور ہماری موجودہ طرزِ معاشرت کا تعلق ہے، ان مضامین کی تدریس میں بھی ہم کوئی خاص امتیازی رنگ یا انفرادیت پیدا نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر ہم اپنے ہاں بی۔ اے یا ایم اے میں نفسیات یا معاشیات کے نصاب کو اس نصاب سے جو ان مضامین کے انہی درجوں میں مثلاً بھارت میں رائج ہے، کچھ زیادہ مختلف یا بہتر نہیں بنا سکتے۔

البتہ تین مضامین میرے نزدیک ایسے ہیں جن کو ہم اپنی ضروریات اور قومی امنگوں کے مطابق، باقی ساری دنیا کے طرزِ تدریس یا نقطۂ نظر سے بے تعلق اور بے نیاز ہو کر جس طرح چاہیں پڑھا سکتے ہیں اور یہی وہ میدان ہے جس میں مناسب اقدامات سے ہم اپنی اس آرزو کی تکمیل کر سکتے ہیں جس کا نعرہ لگاتے لگاتے ہمارے حلق خشک ہو گئے ہیں۔ میری مراد یہاں اُردو (اور بنگلہ) تاریخ اور اسلامیات سے ہے۔

زبان کی تدریس اور بالخصوص قومی زبان کی تدریس میں تین پہلو ملحوظ رکھے جا سکتے ہیں۔ اوّل، زبان کا پہلو۔ دوم ادب کا پہلو اور سوم اس ثقافت اور تہذیب کا پہلو جو کسی زبان کے ادبِ عالیہ کی روح میں کارفرما ہوتی ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ گزشتہ بیس برس میں ہم نے زبان کی تدریس کے ان پہلوؤں کو نہ واضح طور پر جانا اور نہ کسی معقول منصوبے کے تحت ان سے کام لیا۔ ثقافت کا پہلو تو خیر سرے ہی سے نظروں سے اوجھل رہا۔ آپ اُردو کے نصاب کو پہلی جماعت سے لے کر ایم۔ اے تک دیکھ ڈالئے۔ اپنے ثقافتی ورثے کو نئی نسل تک پہنچانے اور مؤثر طور سے منتقل کرنے کا مقصد اور شعور آپ کو کہیں کارفرما دکھائی نہ دے گا۔ حالانکہ زبان کی تدریس کی افضل ترین غایت اور سطح یہی ہوتی ہے اور دنیا بھر کے ترقی یافتہ ملک اپنی اپنی قومی زبان کی تدریس میں یہی غایت پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

باقی رہے زبان اور ادب کے پہلو۔ سو ان کا حشر بھی ایک المیّہ سے کم نہیں۔ بے مقصدی اور کم شعوری کے باعث ان پہلوؤں میں کسی ترتیب اور تدریج کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ آپ کو چھٹی یا ساتویں جماعت میں ایسے ادب پارے مل جائیں گے جو ایف۔ اے یا بی۔ اے میں پڑھائے جانے چاہئیں اور ایف۔ اے اور بی اے میں ایسے 'منتخبات' پائے جاتے ہیں جو مڈل یا زیادہ سے زیادہ میٹرک کے نصاب میں جگہ پانے کے قابل ہوں۔

بعض درجوں میں نصاب بے پروائی اور بے دانشی کا افسوس ناک مظہر ہے۔ اس کی ایک حقیر سی مثال

یہ ہے کہ پچھلے پینتیس چالیس سال سے بی اے کے اختیاری اُردو کے نصاب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ یہ پرچہ پہلے پچاس نمبر کا ہوتا تھا اور اب ایک سو نمبر کا ہے۔ میرے زمانۂ طالب علم (۱۹۴۰-۱۹۴۲) میں بھی استاد جماعت میں دیوانِ غالب کی آخری ردیف پڑھاتے تھے اور میرے اساتذہ کا بیان ہے کہ بی۔اے میں خود انھوں نے بھی یہی ردیف پڑھی تھی اور اب بھی طلباء دیوانِ غالب کی وہی ردیف پڑھتے ہیں۔ قریب قریب یہی حال دوسرے درجوں کا ہے۔

یہ فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے کہ طالب علموں کی ذہنی تربیت اور جذباتی پرداخت میں قومی زبان و ادب کا حصّہ زیادہ ہوتا ہے کہ قومی تاریخ کا۔ دراصل دونوں مضامین اگر مناسب اور درست طور سے پڑھائے جائیں تو طالب علموں کے دل و دماغ پر نہایت گہرے اور فیصلہ کن اثرات پیدا کر سکتے ہیں۔ ادب حال اور مستقبل کے مسائل میں نظر بہم پہنچاتا ہے اور طالب علم کی شخصیت کی تعمیر ایک بلند انسانی سطح پر کرتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ماضی کے مسائل میں فہم اور بصیرت بخشتا ہے اور طالب علم کو نہ صرف اس کی ذات کا ایک پختہ اور سچا شعور، قومی سرگزشت کے حوالے سے دیتا ہے بلکہ اس کے مستقبل کے منصوبوں میں اس کی صحیح رہنمائی اور مدد کرتا ہے۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ سوائے استثنائی صورتوں کے (جو تعلیم کے بغیر بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں) ہمارے ہاں نہ قومی ادب سے اور نہ قومی تاریخ کے مطالعہ سے ان مقاصد کے حصول میں کچھ مدد لی جا رہی ہے۔ تاریخ کی تدریس غالباً قومی زبان کی تدریس سے بھی زیادہ ناقص، بے مقصد اور غیر منسوب ہے۔

اسلامیات کی حالت اُردو اور تاریخ سے بہتر نہیں ہے۔ یہاں بھی جس درجے میں جن موضوعات کو جیسی زبان میں پڑھانے کی ضرورت ہے، ہم اس کے شعور سے عاری بڑی حد تک جذبات کا سوانگ رچانے میں مصروف ہیں۔

یہ موقع نہیں کہ میں اُردو، تاریخ اور اسلامیات کی موجودہ تدریس کے نقائص بہ تفصیل بیان کروں اور ان ضروریات کا خاکہ پیش کروں جن کو ملحوظ رکھے بغیر ہم ان مضامین کی تدریس سے اپنی نئی نسل کی صحیح ذہنی اور روحانی تربیت کرنے کے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہونا چاہیئے کہ سب تدریسی مضامین میں یہ تین مضامین تربیّت کے خاص مضامین ہیں اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نظام تعلیم میں اسلامی قدروں کی ترویج ہو اور ہماری نئی نسل اپنی ثقافت سے محبت کرنا سیکھے اور صحیح خطوط

پر اس کی ترقی میں ہمارا ہاتھ بٹائے تو ہمیں ان مضامین کی تدریس کو بہترین درسی معیار پر لانے کی طرف فوری توجہ دینی چاہیئے۔ اور ان کو ان کی موجودہ پست اور بے نتیجہ تدریسی سطح سے نکالنے کا جتن کرنا چاہیئے۔

اس ضمن میں دو تجاویز میں اور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان یا صوبائی حکومت کو چاہیئے کہ ملک کے تین چار ایسے افراد انتخاب کر کے جن کا تعلیم میں معقول تجربہ ہو۔ لیکن جنہوں نے صرف تعلیم پر غیر ملکی مصنفین ہی کی کتابیں نہ پڑھی ہوں بلکہ اپنے ہاں کے تعلیمی مسائل پر خود ہی غور و فکر کیا ہو (اور اس غور و فکر کا ثبوت بہم پہنچایا ہو) انہیں تدریس کے جدید ترین رجحانات مطالعہ کرنے اور ان پر رپورٹ مرتب کرنے پر مامور کرے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہمارے یہ ماہرین تعلیم ایک طرف تو ترقی یافتہ غیر اشتراکی ممالک میں سے بعض مثلاً امریکہ، انگلستان یا مغربی جرمنی اور دوسری طرف روس، مشرقی یورپ اور چین کا دورہ کر کے دونوں طرح کے ممالک میں سے چند کے مروجہ نظام ہائے تعلیم کا بغور مطالعہ کریں اور درس و تدریس کے میدان میں جو انقلاب، خصوصاً چین میں آیا یا لایا گیا ہے، اس کا بہ چشم خود مشاہدہ کر کے ہمیں بتائیں کہ یہ قومیں اپنی اپنی نئی نسل کو اپنے اپنے قومی مقاصد سے وابستہ رکھنے اور ان کے ذہن و کردار کو اپنی اپنی قومی آرزوں کے مطابق استوار کرنے کے کیا جدید وسائل و ذرائع اختیار کئے ہوئے ہیں اور ہم اہلِ پاکستان کو اپنی نئی نسل کی اپنے مخصوص مقاصد کے پیشِ نظر کس طرح تربیت کرنی چاہیئے اور اپنے نظامِ تعلیم میں کیا کیا تبدیلیاں لانی چاہئیں جن کی بدولت ہم کو بھی اپنے مقاصد میں وہ کامیابی حاصل ہو جو مثلاً امریکہ، روس یا چین کو ان کے مقاصد میں نصیب ہے

دوسری تجویز یہ ہے کہ جب ہم اپنے طور پر یہ کام کر لیں تو آر۔ سی۔ ڈی کے تحت یعنی ترکی اور ایران (اور دوسرے آمادۂ تعاون اسلامی ملکوں) سے مل کر ایک تعلیمی کمیشن ترتیب دیں جو اس اہم سوال کا جائزہ لے کہ جدید زمانے میں نظامِ تعلیم کو اسلام کی روح سے ہم آہنگ کرنے کے کیا معانی ہیں۔ اور اس غرض سے ہم کو کیا کیا طریقے اور وسیلے اختیار کرنے چاہئیں۔

(۴)

غیر اسلامی ثقافتوں کی طرف ہمارا رویّہ

ہماری بہت سی مشکلوں اور الجھنوں کا ایک باعث یہ ہے کہ ہم مسلمان بحیثیت مجموعی اس بات کا کوئی واضح شعور نہیں رکھتے کہ دنیا بھر کی دوسری تہذیبوں اور قوموں کی طرف ہمارا رویّہ ٹھیک ٹھیک

کیا ہونا چاہیئے اور اس رویّے کے متعین کرنے میں کن اصولوں اور ضابطوں کی پابندی ہم پر لازم ہے۔

صدیوں سے عام مسلمانوں اور مولوی حضرات، کا طرزِ عمل کچھ یہ رہا ہے کہ تمام غیر اسلامی دنیا کے خلاف مستقلاً اعلانِ جنگ کئے رہو اور جو قوم مسلمان نہیں اور جو ثقافت اسلامی نہیں اس سے جہاد جاری رکھو۔ یہ طرزِ عمل بظاہر جس قدر اسلامی اور مبنی بر غیرتِ ایمانی معلوم ہوتا ہے، حقیقتاً اسلامی تعلیمات کے اسی قدر منافی اور سچی اسلامیت کی ضد ہے۔

رسول اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ آنحضرتؐ نے حالات کے مطابق یہودیوں اور غیر مسلم عرب قبائل سے باہم پُرامن رہنے، کسی طرف سے جارحیت کی صورت میں ایک دوسرے کی امداد کرنے اور معاشرتی لین دین برقرار رکھنے کے لئے معاہدے کئے۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ جب تک فریقِ ثانی معاہدے کا پابند رہا، آنحضرتؐ نے اس کو حلیف جانا اور اس کے ساتھ ہر طرح کی مروّت اور حسنِ اخلاق سے پیش آئے اس سے کم از کم یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو دفاع، فروغِ امن اور معاشرتی لین دین کے لئے حلیف بنا سکتے ہیں اور کسی قوم یا معاشرے کا غیر مسلم ہونا بذاتِ خود یہ جواز مہیا نہیں کرتا کہ مسلمانوں کو ان کے خلاف ازلی و ابدی طور پر برسرِ پیکار ہونا چاہیئے۔

قرآن حکیم میں علاوہ معاہدوں کی سختی سے پابندی کے خواہ معاہدہ دوست سے ہو یا دشمن سے، اہل کتاب سے ہو یا کفّار سے، دو اصول غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کے اور بیان ہوئے ہیں جن میں سے ہمیں رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے۔

پہلا اصول یوں بیان ہوا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ

(سورۃ المائدہ: ۸) ——— کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس امر پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو۔ وہ پرہیزگاری کے بہت نزدیک ہے اور اللہ سے ڈرو۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انصاف وہ تقاضا اور حکم ہے جو دشمنوں کے ضمن میں بھی ٹل نہیں سکتا اور جسے ضرور پورا ہونا چاہیئے۔

دشمنوں کے ساتھ انصاف!

ذرا غور تو فرمایئے اس کی دلالتوں کا میدان کتنا وسیع اور غیر محدود ہے۔ ظاہر ہے اس سے یہی مراد

نہیں کہ اگر دشمن سے کوئی معاہدہ کرو تو اسے نبھاؤ۔ اس حکم اور نص قرآنی کا یہ مطلب بھی ہے کہ اگر کسی دشمن قوم میں نیکی اور خیر اور اچھائی اور فلاح کی باتیں دیکھو تو ان کی قرار واقعی داد دو اور اس کا اعتراف کرو کیونکہ کسی ایسے گروہ کو جو سچ بولتا ہو، دوسروں کا مال نہ کھائے، باہم ہمدردی اور اخوت کے جذبے کے ساتھ زندگی بسر کرے، اس کے متعلق خاص ان امور میں بُری رائے قائم کرنا یا اس کی اچھائیوں کو برائیاں ظاہر کرنا انصاف کے صریحاً خلاف ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی قوم کا (خواہ وہ دوست ہو یا دشمن) طرزِ تعلیم عمدہ ہے یا اس کے سیاسی اور معاشرتی ادارے اعلیٰ درجے کے ہیں یا اس کا معاشی نظام سب کی بھلائی اور بہبود پر استوار ہے، تو اس حکمِ قرآنی کی رُو سے ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس حد تک اس قوم کی خوبیوں کا فراخدلی کے ساتھ اعتراف کریں تاکہ انصاف کا تقاضا پورا ہو، نہ یہ کہ محض یہ جان کر کہ وہ قوم کلمہ گو نہیں ہم اس کی ہر بات کو ضلالت اور اس کی ہر خوبی کو گمراہی قرار دینے پر اُڑ جائیں۔

دوسرا حکم قرآنی جو اس ضمن میں ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیئے، یہ ہے:۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (سورہ المائدہ:۲)

——— اور بھلائی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ہرگز تعاون نہ کرو۔

آپ نے دیکھا قرآن حکیم نے تعاون اور عدم تعاون کا ایک ابدی لائحہ عمل ہمارے سامنے رکھا ہے۔ اس کی رُو سے ہمارے تعاون اور عدم تعاون کا انحصار فریقِ ثانی کے حسب نسب اور شناخت پر نہیں بلکہ اُس مقصد اور میدانِ کار پر ہے جس کی خاطر آپ کسی سے تعاون یا عدم تعاون کرنے والے ہیں۔ نیکی، اچھائی، عام بہبود اور بہتری کی خاطر تعاون خواہ کسی سے ہو (مسلم سے ہو یا غیر مسلم سے، اپنوں سے ہو یا بیگانوں سے) قرآن کی نظر میں مستحسن ہے اور برائی اور گناہ اور زیادتی کی غرض سے تعاون خواہ والدین ہی سے کیوں نہ ہو، ممنوع ہے۔ قرآن کی نظر میں غیر مستحسن اور قبیح ہے۔

اگر ہم ان ضابطوں اور قرآنی اصولوں پر عمل پیرا ہوں اور ان کی معنویت کو سمجھنے کی عملاً کوشش کریں تو ہمارے ذہنوں کا بہت سا انتشار اور ہمارے دماغوں کی بہت سی تنگیاں اور تاریکیاں دُور ہو سکتی ہیں اور دنیا بھر کی باقی ثقافتوں کی طرف جب ہم حق و انصاف اور عدل و اعتراف کی نظروں سے دیکھیں گے تو مجھے یقین ہے ہمارے بہت سے مسائل ہمارے لئے اتنے مشکل اور کٹھن نہیں رہیں

گے، جتنے وہ اب ہیں۔

(۵)

عالمِ اسلام کا اتحاد

بظاہر یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ پاکستان میں اسلام کے استحکام کا عالم اسلامی کے اتحاد سے کیا تعلق ہے یا کم از کم اس کو ایک بنیادی شرط کے طور پر کیوں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کا سبب میں ابھی بیان کرتا ہوں دراصل بات یہ ہے کہ جب تک کوئی مشن یا نصب العین اپنی وسعتوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے نہ رہے اور اس کے حصول کی تڑپ مسلسل دلوں کو گرماتی اور جلاتی نہ رہے، وہ نصب العین اپنی محدود معقولیت بھی کھو بیٹھتا ہے اور اس سے وابستہ افراد آہستہ آہستہ دلوں کے سرد اور ہمتوں کے پست ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم پاکستان میں اسلام کا استحکام چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم ان بنیادوں پر کام کریں جو دنیا بھر میں یا کم از کم اسلامی ملکوں میں اسلام کی حیثیت کو اس کی موجودہ حیثیت سے بہتر اور زیادہ مضبوط کر دے۔ اسلام کی سربلندی اور نشاۃِ ثانی کی تحریکیں قریب قریب ہر اسلامی ملک میں اٹھ رہی ہیں۔ ان میں بعض عناصر رجعت پسند اور ترقی کی راہ میں حائل بھی ہیں لیکن انہی تحریکوں سے وابستہ کروڑوں افراد ایسے بھی ہیں جو اسلام سے سچی محبت اور جدید مسائل کا فہم دونوں رکھتے ہیں۔

آج کا دور ملکوں اور مملکتوں کی حدود سے نکل کر ہم خیالوں اور ہم نظروں کے اکٹھے ہونے کا دور ہے۔ اشتراکی اور غیر اشتراکی ممالک اپنی اپنی قومیتوں سے باہر عقائد و نظریات کا اشتراک ڈھونڈ رہے ہیں اور زندگی کی کشمکش میں اس اشتراک کو اتحاد کا رنگ دیکر مضبوط سے مضبوط تر ہوتے جاتے ہیں۔ جس تکنیک کو اہلِ مغرب اور اہلِ مشرق نے اب کہیں جا کر دریافت کیا ہے، اسلام اسے صدیوں پہلے بروئے کار لایا تھا۔ قرونِ اُولیٰ میں مسلمانوں کے فروغ اور اسلام کے استحکام کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ مسلمانوں نے اپنے نصب العین تبلیغِ اسلام اور اتحاد بین المسلمین۔ سب کو غیر محدود رکھا اور اسے قبیلوں، گروہوں اور ملکوں کی تنگ نائے میں گھرنے نہ دیا۔

دوسری وجہ میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ غور سے دیکھئے تو کم از کم علامہ اقبال کی حد تک تحریکِ پاکستان دراصل ایشیا میں اسلام کے فروغ و استحکام کی طرف پہلا قدم تھا۔ آپ علامہ اقبال مرحوم کے دونوں سیاسی خطبے — الہ آباد کا مسلم لیگ کا خطبہ ۱۹۳۰ اور لاہور کا مسلم کانفرنس کا خطبہ ۱۹۳۲ اور قائداعظم کے نام ان کے خطوط اور ان کے دیگر سیاسی بیانات دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ علامہ اقبال

برصغیر کی تقسیم، بالخصوص شمال مغربی ہند میں ایک آزاد اسلامی مملکت کے قیام کو برصغیر کے مسلمانوں کی نجات کے علاوہ خود اسلام کے روشن مستقبل کے لئے بھی ناگزیر خیال کرتے تھے اور ان کے افکار اور فکر مندیوں کی تہ میں یہ دونوں آرزوئیں ساتھ ساتھ کارفرما تھیں۔ یہ اس لئے کہ وہ برصغیر کے شمال مغرب میں مسلمانوں کے استحکام اور مشرق وسطیٰ میں اسلام کے فروغ اور طاقت کو لازم و ملزوم خیال کرتے تھے۔ رفتارِ زمانہ سے باخبر لوگ گواہی دیں گے کہ علامہ اقبال کی وفات کے بعد سے اب تک واقعات نے جو رنگ اختیار کیا ہے، اس سے علامہ مرحوم کے فکر و نظر کی صداقت اور اصابت اور عیاں ہوتی ہے اور اگر پاکستان کے مسلمانوں نے اس جذبے اور مقصدیت کو کھو دیا جو اقبال کی بصیرت نے ان کو دیا تھا تو یہ کوتاہی خود ان کے حق میں کوئی نیک فال ثابت نہ ہوگی۔ جیسا میں نے اوپر کہا ہے قوموں کی زندگی ان کے نصب العین کی وسعت پذیری اور اس کے لئے مسلسل جدوجہد کرنے میں ہے، اس سے نظریں چرانے یا اسے بھول جانے میں نہیں۔

عالم اسلامی کے اتحاد سے یہی مراد نہیں کہ حکومتوں کی سطح پر آر۔سی۔ڈی (RCD) جیسے باہمی تعاون کے ادارے وجود میں لائے جائیں۔ یہ ادارے بھی ہمارے اتحاد کا مظہر ہیں اور بے حد مفید کام سرانجام دے سکتے ہیں تاہم جس بات پر یہاں زور دینا چاہتا ہوں، وہ عوام کا شعور اور اسلامی ملکوں کے اندر ایک صحت مند مگر مضبوط رائے عامہ کی تخلیق کا سوال ہے جو اپنے معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل کرنے کی حامی اور علمبردار ہو۔

یہاں ایک خطرے سے آگاہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ عالم اسلامی کے اتحاد کی مہم میں جس شعور و جذبے کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس کا صحت مند، متوازن اور مناسب خطوط پر فعال ہونا ضروری ہے۔ تحریکِ خلافت کے زمانے میں برصغیر کے مسلمانوں نے اسلامی محبت و اتحاد کے نام پر بڑے جوش و خروش اور ایثار و قربانی کا ثبوت دیا تھا لیکن اس جوش و خروش میں توازن، صحت مندی اور حقیقت پسندی کے عناصر کم تھے۔ آج ہمیں جس شعور کی ضرورت ہے، وہ زیادہ مثبت اور حقیقت پسند ہونا چاہیئے تاکہ اس کے ذریعے اسلام کے صرف نعرے بلند نہ ہوں اور زورِ بیان سے محض جذبات میں گرمی اور تیزی پیدا نہ ہو بلکہ راہ کی مشکلات اور موانع پر نظر رکھتے ہوئے ہم آہستہ آہستہ منزل مقصود کی طرف ہموار اور مضبوط قدموں سے آگے بڑھنے کے قابل ہوں۔ اور ایک معقول مدت میں

ایسے ادارے (معاشی اور سیاسی) قائم کر سکیں جنہیں بیسویں صدی میں اسلامی تعلیمات کی عملی تعبیر قرار دیا جا سکے۔

مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی حالیہ جارحیت ہمیں دو طرح سے متاثر کر سکتی ہے۔ ہمارے درمیان جو حضرات اسلام کے مستقبل سے مایوس اور عالم اسلام کے اتحاد سے بے تعلق ہیں، بلاشبہ ان کی مایوسی اور بے تعلقی میں اضافہ ہوا ہوگا لیکن جو لوگ اسلام کے مستقبل پر یقین رکھتے ہیں اور عالم اسلام کے اتحاد کے لئے کام کرنے کے آرزومند ہیں، ان کے لئے اسرائیل کی کامیابیوں اور عربوں کی ناکامی میں یہی سبق پوشیدہ اور عیاں ہے کہ جب تک ہم حقیقت پسندی سے کام لینا نہیں سیکھیں گے اور جذبات کی تیزی اور نعرہ بازی کی راہ ترک نہیں کریں گے، ہم اپنے ارادوں میں کامیاب اور اپنی آرزوؤں میں سرخرو نہیں ہو سکتے۔

عالم اسلام کا اتحاد نہ سہل ہے اور نہ غیر ممکن۔ انسانی تاریخ کے تمام عظیم نصب العینوں کی طرح بلاشبہ یہ مشکل اور کٹھن ضرور ہے اور اپنے حصول کے لئے آئین فطرت کے مطابق کاوشوں کی پختگی، تدبّر و فراست اور مسلسل جد و جہد کا تقاضا کرتا ہے۔

اور اسرائیل کی جارحیت کا اشارہ اس طرف بھی تو ہے کہ اگر مسلمان اب بھی نہ سنبھلے اور انھوں نے حقائق بینی سے کام نہ لیا اور وہ متحد نہ ہوئے تو پھر شاید کوئی اور موقع ان کو اس غرض کے لئے ہاتھ نہیں آئے گا۔